© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

قرآن حکیم کی لسانی خصوصیات

لفظ و معنی دونوں کا وحی ہونا

قرآن حکیم کو یہ شرف حاصل ہے کہ جس طرح اس کا پیغام اللہ کا پیغام ہے، اور اس میں مندرج معانی اور مطالب کا ذخیرہ ربوبیت کبریٰ کی فیض رسانیوں کا کرشمہ ہے۔ اسی طرح اس کے الفاظ و حروف اور کلمات کی ترتیب و ساخت کا تعلق بھی براہ راست ربوبیتِ کبریٰ کی ارزانیوں سے ہے۔ یعنی یہ کتاب ہدیٰ، عالم لاہوت و ناسوت کے درمیان رشتہ و تعلق کی ایسی نوعیت ہے جو لفظ و معنی دونوں کو آغوشِ تنزیل میں لیے ہوئے ہے۔ کلام و معنی دونوں کی اہمیت یہاں یکساں ہے دونوں وحی ہیں۔ دونوں الہام ہیں۔ یا یوں کہیے کہ دونوں باہم لازم و ملزوم یا جسم و روح کا سا ناتا رکھتے ہیں۔ نہ الفاظ مستقل بالذات اور معانی سے تہی اور بے نیاز ہیں اور نہ معانی ایسی تجرید سے متصف کہ اظہار و تبیین کے لیے الفاظ و حروف کی منت پذیری سے آزاد ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کا اولین اطلاق الفاظ و حروف کے اسی مجموعہ پر ہوتا ہے جسے قول و کلام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جسے ہم دیکھتے، پڑھتے اور سنتے ہیں:

انا سنلقی علیك قولاً ثقیلا [۱]

ہم عنقریب تم پر بھاری قول (فرمان) اتاریں گے۔

وان احد من المشرکین استجارك فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ [۲]

اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دو، یہاں تک کہ کلام الٰہی سننے لگے۔

لفظ و معنی میں تفریق کی اس بدعت کو ابھارنے اور رواج دینے کی ذمہ داری معتزلہ پر عائد ہوتی ہے۔ ان سے اس تصور کو باطنیہ نے لیا، اور یہ کہہ کر پوری شریعت کا حلیہ ہی بدل ڈالا کہ اصل اہمیت

---

[۱] المزمل: ۵   [۲] التوبۃ: ۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معانی کو حاصل ہے اور الفاظ کی حیثیت اس سلسلہ میں محض ثانوی اور دوسرے درجہ کی ہے۔

لفظ و معنی کی بحث میں معتزلہ کی ذہنی مجبوری

معتزلہ کی ذہنی مجبوری ان کی مناظرہ بازی تھی۔ ان کا عیسائی مناظرین سے جب ٹکراؤ ہوا اور موضوعِ بحث یہ مسئلہ ٹھہرا کہ ایک انسان خدا کی صفات کا حامل کیوں کر ہو سکتا ہے؟ یا غیر محدود، محدود کے قالب میں کیوں کر سما سکتا ہے؟ تو عیسائی مناظرین کی طرف سے تجسیم، (INCARNATION) کی حمایت و مدافعت میں یہ کہا گیا۔ بالکل اسی طرح، جس طرح کلامِ الٰہی کا بحرِ زخار الفاظ و حروف کی جوئے تنگ میں جلوہ طراز ہے۔ بظاہر جواب کی یہ نوعیت لگتی ہوئی سی تھی، معتزلہ اور متکلمین نے فوراً پینترا بدلا، اور کہا کہ تنزیل و وحی کا ہدف معانی ہیں، الفاظ و حروف نہیں۔ جس کا آخر آخر میں یہی مطلب نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو بطور وحی و تنزیل کے قلبِ پیغمبر میں اتارا، وہ الفاظ کی بجائے چند معانی اور مضامین تھے، جیسے توحید، عدل، امر بالمعروف، نہی عن المنکر وغیرہ۔ اور ان کو الفاظ و حروف کا جامہ پیغمبر علیہ السلام کے فکر و شعور نے الفاظ کی صورت میں پہنایا۔ اس لیے جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، تجسیم معانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خلق قرآن کا نعرہ اسی لیے بلند کیا گیا کہ عیسائیوں کے اس اعتراض سے بچاؤ کی کوئی صورت نکل سکے۔

"اخوان الصفا" کے ملحد مصنفین نے اس مصرع طرح پر پوری غزل ہی کہہ دی، اور متن اور نصوص قرآن کو ایسی ایسی تاویلاتِ باطلہ کے سانچے میں ڈھال دیا جس سے دین کا مفہوم ہی مسخ ہو کر رہ گیا۔

باطنیہ کی اصل مجبوری چھوٹی اور سطحی نوعیت کی عقلیت پرستی (INTELLECTUALISM) تھی۔ انھوں نے تسکین نفس کے لیے ایسے عقائد و تصورات گھڑ لیے تھے اور زندگی کے چلن کو اس طرح اباحت و تعطل کی آلائشوں سے آسودہ کر رکھا تھا کہ قرآن کی نصوص قطعی اور واضح ہدایات کی روشنی میں ان کی تائید نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے انھوں نے قرآن کے ظاہر سے ہٹ کر اس کے منفرد و باطن معنی پر خصوصیت سے زور دیا، تاکہ تاویل و تفسیر کے ایسے انداز و اسلوب کے لیے گنجائش پیدا کر سکیں، جو ان کی ملحدانہ خواہشات کو پورا کر سکے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لسانیات کی شہادت

معتزلہ اور باطنیہ کے موقف میں غلطی۔ معنی کسی بھی سطح پر الفاظ کی گرفت سے آزاد نہیں

معتزلہ اور باطنیہ کے اس موقف میں گھپلا یہ پنہاں ہے کہ ان لوگوں نے پہلے تو خواہ مخواہ یہ فرض کر لیا کہ معانی کا الفاظ و حروف سے قطع نظر کر کے اپنا مستقل بالذات وجود ہے۔ اور پھر یہ سمجھ لیا کہ الفاظ اور پیرایۂ بیان انھی معانی کی تجسیم ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ لفظ و معنی میں شروع ہی سے ایک طرح کا لزوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فکر و شعور کی کسی بھی سطح پر ہم معانی کو الفاظ کی گرفت سے آزاد فرض نہیں کر سکتے۔ ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ اول اول الفاظ و حروف کا احساس واضح نہ ہو، اور اس صورت میں تصور اور تصویر بھی واضح نہیں ہو سکتا، اور پھر آہستہ آہستہ لفظ و معنی دونوں زیادہ نکھرتے اور واضح ہوتے چلے جائیں۔ یہی وہ سچائی ہے جس کو نفسیات کے ماہرین تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔

نفسیات سے قطع نظر لسانی اور تشریحی لحاظ سے بھی اس حقیقت کو ماننا پڑتا ہے کہ الفاظ و حروف میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ کہ اظہار و صراحت کے کسی بھی مرحلہ میں یہ ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو پاتے۔ مثال کے طور پر لفظ و معنی کے باہمی تعلق و ربط کو پہلے لسانیات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کیجیے۔

لسانیات کے کسی بھی ماہر کے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ زبان کا تار و پود کب تیار ہوا۔ یہ مسئلہ بھی بجائے خود متنازعہ فیہ ہے کہ اس کا آغاز کیوں کر ہوا۔ کیا اس معاملہ میں بھی انسان کی روحانی، اخلاقی رہنمائی کی طرح وحی و تنزیل نے دستگیری کی۔ یا حضرتِ انسان کے داخلی و خارجی عوامل کے تصادم اور تجربات سے آہستہ آہستہ اور بتدریج اس کا ہیولیٰ بنا۔

لیکن اس بارہ میں دو رائیں پائی نہیں جاتیں کہ قوموں کے عروج و ارتقا کی تاریخ میں الفاظ و حروف، یا زبان ہی ایک ایسا عامل ہے جس نے تخلیقی کردار ادا کیا ہے۔ یعنی اگر زبان نہ ہوتی، اور انسان کسی پیرایۂ اظہار سے آشنا نہ ہوتا، تو فکر و شعور کا ارتقا، نہ صرف رک جاتا، بلکہ معرضِ ظہور ہی میں نہ آپاتا۔ الفاظ و حروف یا زبان کی اس تاثیر اور کردار کا ذکر قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وعلّم آدم الاسماء کلہا۔[۳۵]

جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اخلاق اور تہذیب و تمدن کے زیور سے آراستہ کرنے سے پہلے زبان سکھلائی، تاکہ یہ پہلا انسان خارج کے بارہ میں اپنے داخلی احساسات کا اظہار کر سکے۔

یہاں یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ ہم اس کے داخلی احساسات کو تجرید محض کی حیثیت نہیں دیتے بلکہ اس کے برعکس یہ مانتے ہیں کہ یہ اول اول خارج کے عکوس و اظلال تھے جنھیں ہم غیر واضح اور زبان کے غیر مکمل نقوش بھی کہہ سکتے ہیں جنھوں نے آگے چل کر عنایت الٰہی سے مکمل زبان کی صورت اختیار کی۔

لفظ و معنی کے بارہ میں ہمارا موقف یہ نہیں کہ الفاظ نے معانی کو جنم دیا ہے، بلکہ یہ ہے کہ وجود کی ہر ہر سطح پر یہ دونوں ہمیشہ پہلو بہ پہلو جلوہ گر رہے ہیں۔ اور یہ ایک الگ بات ہے کہ کبھی معنی اجمال و اخفا کے پردوں میں مستور رہا، اور کبھی زبان سے متعلق محسوس ہوا کہ یہ معانی کی پوری پوری ترجمانی سے قاصر رہی۔ ہم دراصل صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ معنی چاہے کتنا اجمال و اخفا کے پردوں میں ڈھکا رہے، الفاظ کے کسی نہ کسی جامے سے اتصاف پذیر ضرور رہتا ہے۔

زبان صرف ذریعۂ اظہار ہی نہیں، اس میں تخلیق کا ایک پہلو بھی پنہاں ہے

الفاظ کی بحث چھڑی ہے تو یہ بھی جان لیجیے کہ یہ صرف اظہار و تبیین کا پیمانہ ہی نہیں۔ اس میں ایک پہلو تخلیق و آفرینش کا بھی ہے۔ یعنی یہ وہ صدائے کن بھی ہے، ترجمانی کے علاوہ جس سے نئے نئے معانی کی تخلیق بھی معرض ظہور میں آتی ہے۔ بائبل کی زبان میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ کلمہ (LOGOS) ہے جو ایک طرف اگر منشائے الٰہی پر دلالت کناں ہے تو دوسری طرف تخلیقی صلاحیتوں سے بھی بہرہ مند ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے، کلام معنی کا حامل بھی ہے اور معنی آفرین بھی۔ یہی وہ عارفانہ نکتہ اور حقیقت تھی جس کا یوحنا نے یہ کہہ کر اظہار کیا کہ ابتدا میں کلام تھا۔

---

[۳۵] البقرہ: ۳۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اپنے پیرایۂ بیان میں یوں ظاہر فرمایا ہے :

انما امرہٗ اذا اراد شیئاً ان یقول لہٗ کن فیکون ؂۵۴

اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہ دیتا ہے ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔

کلام و معنی کی اس تشریح سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ قرآن حکیم کی جب تشریح کی جائے اور کچھ اونچے اور عارفانہ اسرار و رموز پر سے پردہ سرکایا جائے تو صرف انہی معانی پر اکتفا کیا جائے جن کا تشرح اول نظر میں الفاظ و حروف سے ہوتا ہے اور دلالت و اظہار کے ان تیوروں کو ملحوظ خاطر نہ رکھا جائے جن کا تعلق ، حذف و تقدیر، ادائے بلاغت یا کلام میں کنایہ و استعارہ اور مجازات کی بوقلمونیوں سے ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنا نہ صرف بدمذاقی کے مترادف ہوگا بلکہ یہ حرکت کلام الٰہی سے کھلی ناانصافی بھی ہوگی اور اسلامیات کی اصطلاح میں حشویت کہلائے گی۔

ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ لسانی سطح پر اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ وحی اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ جب بھی قلبِ پیغمبر پر نازل ہوتی ہے، اپنے ساتھ الفاظ، اصطلاح، پیرایۂ بیان اور متن کی خصوصیات بھی لاتی ہے اور اسی کلیہ کے مطابق قرآن حکیم نہ صرف ایک کتاب اور پیرایۂ اظہار ہے بلکہ اس کا ایک ایک لفظ، حرف، اور نقطہ بجائے خود تعبیر و استدلال کی تمام تر خوبیوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر شوآن اگر یہ کہتا ہے کہ قرآن کے الفاظ و حروف میں ایک طرح کا کیمیائی اثر، یا سحر آفرینی ہے جس سے قلب و ذہن جلا پاتا ہے، انسانی جسم حسن و رعنائی کے قالب میں ڈھلتا اور عالمِ کون و مکان میں انقلاب رونما ہو جاتا ہے ؂۵۵ تو غلط بات نہیں کہتا، بلکہ یہ تو اسی حقیقت کی صدائے بازگشت ہے جس کو اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے :

قال رسول اللہ من قرأ حرفاً من کتاب اللہ فلہ حسنۃ والحسنۃ بعشر امثالھا لا اقول الم حرف بل الف حرف ولام حرف و میم حرف -

آنحضرت نے فرمایا : جو کتاب اللہ کی تلاوت کرتا ہے اس کو ہر ہر حرف کے بدلے ایک نیکی کا سزاوار قرار دیا

؂۵۴ یٰسٓ : ۸۲
؂۵۵ ڈائی مینشن آف اسلام، ص ۵۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے گا جو دس نیکیوں کے برابر ہوگی - میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام دوسرا حرف ہے اور میم تیسرا حرف ہے۔

اور خود قرآن حکیم جب اس کے بارہ میں 'برکت' کا لفظ استعمال کرتا ہے تو اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ اس کے ایک ایک حرف اور لفظ میں تاثیر و تفسیر کے بے شمار پہلو پنہاں ہیں۔

وھذا کتاب انزلنٰہ مبارک [۵۶]

اور یہ کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا، بابرکت۔

قرآن ہمہ مغز اور روح ہے

جس طرح اس کے معانی کو اہمیت حاصل ہے اسی طرح اس کے الفاظ بھی اہم اور بابرکت ہیں۔

ہم ان لوگوں سے قطعی اتفاق رائے کا اظہار نہیں کر سکتے جو اس کتاب کو صرف مفہوم و معنی کے اعتبار ہی سے کتاب سمجھتے ہیں اور اس کی زبان، الفاظ، حروف اور متن کو کسی تقدیس و حرمت کا سزاوار قرار نہیں دیتے۔ یا جو اس کے بارہ میں بھی قشر اور مغز کی اقلی تقسیم روا رکھنے کے قائل ہیں۔ ہمارے نزدیک جس طرح اس کے معانی لائق صد احترام ہیں، ٹھیک اسی طرح اس کے الفاظ و حروف بھی تقدیس و اکرام کے حامل ہیں۔ یہی نہیں اس کے الفاظ و حروف بھی چونکہ نازل ہوئے ہیں اور ان کا تعلق بھی معنی و مفہوم کی طرح آسمان ہی سے ہے، زمین سے نہیں، اس لیے یہ بھی بجائے خود کتاب کے مفہوم میں داخل ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اس کے پیرایۂ بیان اور وہ حقیقت جو بیان ہوتی ہے، اس میں ربط و تعلق کی نوعیت یہ نہیں کہ پیرایۂ بیان تو محض لباس، چلو اور قشر کی حیثیت رکھتا ہے اور جو مفہوم و معنی بیان ہوا ہے وہ اصل، روح اور مغز ہے۔ اس کے برعکس یہ کتاب کل کی کل اپنی تمام جزئیات کے ساتھ مغز اور جانِ عاشقاں ہے اور اس کا کوئی حصہ اور لفظ و شوشہ غیر ضروری، زائد اور غیر اہم نہیں۔

تشریعی سطح پر قرآن حکیم کے الفاظ و حروف کا جزوِ وحی ہونا اس حقیقت سے عیاں ہے کہ اسلامی

---

[۵۶] الانعام: ۹۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فقہ اور تشریع و تقنین کے نظام استدلال کا بیشتر حصہ وہ ہے جس کا تعلق دلالتِ لفظی سے ہے۔ جن لوگوں نے فقہ اسلامی کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور اس لائق صد ستائش ذکری و تہذیبی ورثے کو اس نظر سے دیکھا کہ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، وہ اس نکتہ سے اچھی طرح آگاہ ہیں

فقہ و تشریع کا دار و مدار زیادہ تر دلالتِ لفظی پہ ہے

جہاں تک قرآن حکیم سے استدلال و استنباط کا تعلق ہے، فقہ اسلامی کے دو حصّے ہیں۔ ایک حصہ، ان معنوی اصولوں پر مبنی ہے جو اگرچہ قرآن ہی سے مستنبط ہیں، تاہم ترتیبِ اشیا یا اپنے مزاج کے اعتبار سے دائرہ الفاظ سے زیادہ انہی محیط معنی میں شمار کرنا چاہیے، جیسے قیاس، استحسان اور استصلاح۔

دوسرا حصہ دلالتِ لفظی پر مبنی ہے جیسے دلالت النص، اشارت النص، تضمن اور التزام۔

ظاہر ہے ثانی الذکر نوعیت کا اندازِ استدلال فقہ اسلامی کے بیشتر اور نسبتاً زیادہ قابلِ اعتماد ذخیرہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اصل فقہ کا اطلاق اسی اسلوبِ فکر پر ہوتا ہے۔

قانون و تشریع کے بارہ میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے جو بھی آئین، چند اقدار معانی اور مطالب پر استوار ہوا، ناپائیدار ثابت ہوا، بخلاف اس قانون کے جس کی نیو وحی الٰہی اور نصوص پر رکھی گئی اور جس کا ڈھانچہ مقدس کتابوں میں پہلے سے واضح کر دیا گیا۔

غرض نفسیاتی، لسانی اور تشریعی جس بھی پہلو سے دیکھیے۔ الفاظ، حروف اور متن و نص کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ وحی و الہام کے اس شاہکار میں جسے قرآن کہا جاتا ہے معنی اور لفظ پہلو بہ پہلو یکساں تقدیس کے حامل ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فقہائے ہند (جلد اوّل)

محمد اسحاق بھٹی

برصغیر پاک و ہند وہ خطۂ ارض ہے جو ابتدائی صدی ہجری ہی میں اسلام کی نعمت سے بہرہ مند ہو گیا تھا اور اسی دور سے یہاں اسلامی علوم کے چرچے ہونے لگے تھے جس کے نتیجے میں اس سرزمین کو بے شمار محدثین و فقہا کا مسکن بننے کا شرف حاصل ہوا۔

اس کتاب میں انہی علمائے کرام کا تذکرہ ہے اور اس میں پہلی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کے محدثین و فقہا کے حالات و سوانح قلم بند کر کے ان فقہی کوششوں کو ایک خاص ترتیب و تسلسل کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے، جو سیر و سوانح کے متعدد ذخائر میں بکھری پڑی ہیں۔ نیز اس میں اس حقیقت پر بھی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان فرماں رواؤں نے فقہ اور فقہا کے احترام و حوصلہ افزائی کا کس انداز میں اظہار کیا۔

کتاب کے ابتدائیہ میں فاضل مصنف نے یہ بتایا ہے کہ فقہ کا اسلام میں کیا مقام و درجہ ہے اور یہ کہ مختلف ادوار میں ان جلیل القدر فقہا نے کس طرح اسلامی زندگی کو قانون و ضابطے کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوششیں کیں اور ان سے کیوں کر فقہ کے مختلف مدارسِ فکر ظہور میں آئے۔ مصنف نے ان پچیس صحابہ کرام کی بھی نشان دہی کی ہے جنھوں نے اپنی تشریف آوری سے اس برصغیر کو نوازا۔

اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین کرام یہ محسوس کریں گے کہ ان کے سامنے اسلام کے علمی فیوض کی نئی راہیں منکشف ہو رہی ہیں اور برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے ایسے باب کو اجاگر کیا جا رہا ہے جو اپنے اندر بہت سے معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

صفحات :   قیمت : ۱۳/۷۵ روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com